نواب علی حسن خاں

خانوادۂ علم و فضل کا ایک گوہر آب دار

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی لکھنؤ تشریف لائے اور حسب معمول بھوپال ہاؤس (لال باغ) یعنی نواب علی حسن خان کے دولتکدہ پر مقیم ہوئے ہیں اگرچہ ندوہ کا طالب علم تھا، لیکن سید صاحب سے کافی رسم و راہ ہوچکی تھی، اور جب وہ لکھنؤ آتے تھے تو میں ان سے ملنے ان کی قیامگاہ پر جایا کرتا تھا، سید صاحب نے حسب معمول ایک باوقار لیکن دل افروز تبسم کے ساتھ پذیرائی کی، اور میں ذرا احتیاط کے ساتھ اُن کے پاس بیٹھ گیا، احتیاط اس لئے کہ سید صاحب کے تبسم کا مفہوم سمجھنا کچھ آسان نہیں تھا، جس طرح ایک ننھا بچہ کلکاریاں مارتے مسکراتے ہنستے ہنستے دفعتہً رونے لگتا ہے، اسی طرح سید صاحب کا تبسم دفعتہً زہر خند بن جاتا تھا، اور پھر آنکھوں سے قہر و عتاب کی بجلیاں برسنے لگتی تھیں، لیکن

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا!

تو میں وضع احتیاط کے ساتھ بیٹھا ہوا، سید صاحب کے تبسم کی روشنی میں موضوع گفتگو تلاش کر رہا تھا کہ اُنہوں نے اپنے تبسم کو اور زیادہ وسعت دے کر پوچھا خضر راہ میں "مومن کی شاعری" پر تم نے جو مضمون لکھا ہے مجھے بھی بہت پسند آیا، اور نواب صاحب بھی اسے پڑھ کر بہت خوش ہوئے!" خضر راہ ایک رسالہ تھا جو طالب علمی کے زمانہ میں ہمارے عزیز ہم درس حامد علی ندوی نے نکالا تھا اب دل کو اطمینان ہوا کہ تبسم کی رفتار ٹھیک جا رہی ہے، اور خطرہ سے باہر ہے۔

تھوڑی دیر میں چائے کا وقت ہوگیا، اور نواب صاحب کی طرف سے سید صاحب کی طلبی ہوئی، وہ اُٹھے اور مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اب میں ایک پُر تکلف ایوان میں

تھا، صوفے بچھے ہوئے تھے اور نواب صاحب سید صاحب کے انتظار میں چشم براہ تھے، سید صاحب نے میرا تعارف کرایا، یہی رئیس احمد ہیں، جن کے مضمون کی آپ تعریف فرما رہے تھے، نواب صاحب نے بہت تپاک سے مصافحہ کیا، اور خوش اخلاقی کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

دیوار پر ایک شاندار روغنی تصویر ایک شاندار فریم میں آویزاں تھی، سرخ و سفید رنگ، وجیہہ اور بارعب چہرہ، حسین و جمیل نقش و نگار، ہاتھ میں تلوار، آنکھوں میں چمک، وضع میں شاہانہ رکھ رکھاؤ، اور دبدبہ، یہ تصویر تھی نواب صدیق حسن خاں کی، جو متوسط گھرانے کے ایک شریف فرد تھے، دولت علم سے مالا مال تھے، لیکن دولت دنیا سے محروم تھے، قسمت آزمائی کیلئے بھوپال پہنچے، وہاں نواب شاہجہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کی نظر انتخاب میں کھب گئے، اور ان کے ساتھ شادی ہو گئی، نواب بن گئے، دولت گھر کی کنیز بن گئی، علم اور توسیع علم پر بے دریغ روپیہ صرف کرنے لگے نواب صدیق حسن خاں کی پہلی بیوی کے بطن سے دو فرزند تھے، نورالحسن خاں اور علی حسن خاں، اس وقت ایوان زرنگار میں نواب علی حسن خاں متمکن تھے، لیکن باپ اور بیٹے کی صورت میں کتنا بعد المشرقین تھا، بیٹا کم روئی میں گاندھی جی کا ہم شبیہہ، اور باپ حسن و جمال میں یوسفِ وقت، نواب علی حسن خاں نے حسن صورت تو بلا شبہ باپ سے ورثہ میں نہیں پایا تھا، لیکن دولت و ثروت کے علاوہ دولتِ اخلاق، دولتِ کردار، دولتِ علم، دولتِ معرفت اور دولتِ شفقت و کرم کے خزینے ورثے میں ملے تھے، اور وہ ان کا برمحل اور باموقع استعمال بھی کرتے رہتے تھے۔

ندوہ کی نظامت نواب صاحب نے بڑے اصرار سے قبول کی تھی، اور ایسے زمانہ میں قبول کی تھی کہ ندوہ کی کشتی کو گرد ابوں سے بچاتے، طوفانوں سے ٹکراتے ساحل تک لے ہی آئے، وہ جب تک ندوہ میں رہے ندوہ پر بڑے بڑے کڑے وقت آئے، لیکن آسانی کے ساتھ گزر گئے، انہوں نے اپنے دورِ نظامت میں ندوہ میں اسلامی ہند کے مشہور اور یکتائے روزگار علماء جمع کر لئے تھے، شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں، شیخ التفسیر مولانا عبدالحلیم صدیقی امام فلسفہ و منطق مولانا عبدالودود ندوی، ادب عربی کے یکتائے زمانہ فاضل، مولانا محمد یوسف ندوی، مولانا سید علی زینبی ماہر علم

ہیئت، شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ یہ بزرگ یا تو نواب صاحب کے بلائے ہوئے آئے یا نواب صاحب نے اس مان سے انہیں رکھا کہ کہیں اور جانے کا انہیں خیال بھی نہ آیا، لیکن نواب صاحب کے بعد یہ شیرازۂ علمی منتشر ہو گیا۔

نواب صاحب بڑے جز رس آدمی تھے، بخیل نہیں، وہ موقع پر بے دریغ صرف کرتے تھے، لیکن بے موقع ایک پائی بھی صرف کرنا نہیں چاہتے تھے، اصرار اور التجا پر بھی نہیں، با اصول بھی بہت تھے، ندوہ کو اپنا قیمتی وقت دیتے تھے، پھر ندوہ کو کیا حق تھا کہ ان کی جیب پر للچائی ہوئی نظر ڈالے؟

سنہ ۳۲ئہ کی اسٹرائک کا "قائد اعظم" میں تھا، نواب صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے، بہت شفقت کرتے تھے، میری بہت سی لغزشیں نظر انداز کر چکے تھے، لیکن یہ صدمہ انہیں ایسا پہنچا کہ نہ اسے بھول سکے نہ معاف کر سکے، وصل بلگرامی سے اُنہوں نے شکایت کی کہ سب سے زیادہ صدمہ مجھے یہ ہے کہ اس اسٹرائک کی لیڈری رئیس نے کی، اُنہوں نے مجھ سے کہا چلو میں خطا معاف کرا دوں، میں نے کہا کل آؤں گا، اور پھر نہیں گیا، نواب صاحب کی عزت اور عظمت کے باوجود، اس معاملہ میں ان سے "خطا" معاف کرانا نہیں چاہتا تھا، اور شفقت و محبت کے باوجود وہ بھی اس معاملہ میں میرے ساتھ رعایت کرنا نہیں چاہتے تھے، اسٹرائک کے اختتام کے بعد جب طلبہ کے داخلہ کا سوال پیدا ہوا تو مولانا سید سلیمان صاحب ندوی جیسے با اثر رکن انتظامی معتمد تعلیمات، عزیز دوست اور محبوب رفیق کے فیصلہ کو انہوں نے منسوخ کر دیا، سید صاحب نے بہ حیثیت معتمد تعلیمات میرے داخلہ کے احکام صادر کر دیے تھے اور مطمئن ہو کر اعظم گڑھ چلے گئے تھے، ان کے جانے کے بعد پروفیسر عبد الباری کے مشورہ کے مطابق پہلا کام نواب صاحب نے یہ کیا کہ سید صاحب کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔

نواب صاحب کی آخری زندگی بڑے کرب میں گزری، بہت بڑے علاقہ کے مالک تھے، بمبئی میں بہت سے عالیشان مکانات تھے جو کرایہ پر چلتے تھے، لیکن بدانتظامی کا یہ عالم تھا کہ عمارتیں فروخت ہو رہی تھیں اور جائداد مقروض ہو رہی تھی، حالانکہ صاحب اولاد تھے، اور اولاد سعید، صالح اور تعلیم یافتہ تھی، ایک صاحبزادے بی اے۔ ایل ایل بی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اولاد صالح اور سعید کی موجودگی میں کورٹ آف وارڈس کے حوالہ کرنی پڑی، لیکن حالات پھر بھی کچھ بہت زیادہ نہ سنبھل سکے۔